ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 1954

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اصولِ تفسیر (1954) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 6تا9)

کل نمبر: 100 • [illegible] نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE — For Study & Reference

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، اس گائیڈ کو بطورِ رہنمائی استعمال کریں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: ابدال کا مفہوم و اقسام؛ اسم کی اسم سے تبدیلی کی دس قرآنی مثالیں (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ ابدال کا مفہوم اور اقسام لکھتے ہوئے اسم کی اسم سے تبدیلی کی دس قرآنی مثالیں تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

قرآنِ مجید کے نظم میں بعض مقامات پر ایک لفظ اپنے مألوف مقام کے بجائے دوسرے لفظ کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور پڑھنے والا اگر اس اسلوب سے واقف نہ ہو تو مفہوم میں ٹھوکر کھاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر کے باب دوم میں قرآن کے نظم میں خفا (دشواری) پیدا کرنے والے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ابدال ہے۔ اسی باب کی بدولت طالب علم ان مقامات کی گتھی سلجھا لیتا ہے جہاں بظاہر لفظ کچھ ہے اور مراد کچھ اور۔ اس جواب میں پہلے ابدال کا مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر اس کی اقسام، اور آخر میں اسم کی اسم سے تبدیلی کی دو قرآنی مثالیں وضاحت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

ابدال کا مفہوم

ابدال کے لغوی معنی بدلنا، ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھنا اور ایک شے کو دوسری شے سے تبدیل کرنا ہیں۔ علمِ بلاغت و اصولِ تفسیر کی اصطلاح میں ابدال سے مراد یہ ہے کہ کلام میں کسی لفظ کو اس کے اصل موقع کے بجائے کسی دوسرے لفظ کی جگہ استعمال کیا جائے اور سامع قرائن اور سیاق کی مدد سے اس مراد تک پہنچے جو اصل میں مقصود ہے۔ یہ اسلوب اہلِ عرب کے کلام میں عام تھا اور قرآنِ مجید نے بھی عربی زبان کے اسی محاورے کو اختیار کیا ہے۔ ابدال کی پہچان مفسر کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اگر وہ ہر لفظ کو اس کے ظاہری اور پہلے معنی پر محمول کرے تو بعض آیات کا مفہوم بگڑ جائے گا، جبکہ ابدال کی سمجھ آیت کو درست پس منظر میں رکھ کر معنی کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس دور کے قاری کے لیے نظمِ قرآن کی جن دشواریوں کا ازالہ ضروری ہے، ابدال ان میں سے ایک نمایاں دشواری ہے۔

ابدال کی اقسام

ابدال کی بنیادی تقسیم اس لفظ کی صنف کے اعتبار سے ہوتی ہے جو بدلا جائے۔ اس اعتبار سے ابدال کی چار بڑی اقسام ہیں۔ پہلی قسم اسم کی جگہ اسم کا استعمال ہے، جیسے مفرد کی جگہ جمع یا جمع کی جگہ مفرد آ جائے، یا مصدر اسمِ فاعل و مفعول کی جگہ آ جائے۔ دوسری قسم فعل کی جگہ فعل کا استعمال ہے، جیسے فعلِ ماضی مستقبل کے معنی میں یا فعلِ مضارع ماضی کے معنی میں استعمال ہو؛ مثلاً قیامت کے یقینی واقعات کو ماضی کے صیغے میں بیان کرنا۔ تیسری قسم حرف کی جگہ حرف کا استعمال ہے، جیسے کوئی حرفِ جر دوسرے حرفِ جر

کے معنی میں آئے۔ چوتھی قسم جملے کی جگہ جملے کا استعمال ہے، جیسے جملۂ خبریہ انشائیہ کے معنی میں یا انشائیہ خبریہ کے معنی میں آئے۔ ان چار اقسام میں سے سوال میں خصوصیت کے ساتھ پہلی قسم، یعنی اسم کی اسم سے تبدیلی، کی دس مثالیں مطلوب ہیں، اس لیے آگے کی بحث اسی قسم پر مرتکز رہے گی۔

اسم کی اسم سے تبدیلی کی بھی کئی ذیلی صورتیں ہیں جنہیں مثالوں سے پہلے جان لینا مفید رہے گا۔ کبھی اسم مفرد اسم جمع کی جگہ آتا ہے اور کبھی اس کے برعکس۔ کبھی ایک فرد کو پوری جماعت کے لفظ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ کبھی مصدر اسم مفعول یا اسم فاعل کی جگہ آتا ہے اور کبھی اسم مفعول مصدر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کسی چیز کا اسم اس کے ظرف یا محل کی جگہ اور کبھی ظرف کا اسم اس چیز کی جگہ آ جاتا ہے۔ کبھی صفت کا اسم ذات کی جگہ اور کبھی عضو کا نام قدرت وصفت کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ تمام صورتیں اہلِ لغت کے ہاں معروف ہیں اور قرآنِ مجید میں ان کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جن میں سے دس منتخب مثالیں مع تشریح درج ذیل ہیں۔

اسم کی اسم سے تبدیلی کی دس قرآنی مثالیں

پہلی مثال: مفرد کا اسم جنسِ انسانی کے معنی میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان الانسان لفی خسر، الا الذین آمنوا (سورۃ العصر: 2 تا 3)۔ یہاں الانسان مفرد ہے مگر اس سے پوری جنسِ انسان مراد ہے، اسی لیے اس کے بعد الذین آمنوا کی صورت میں جمع کا استثناء آیا ہے۔ پس مفرد کا اسم یہاں جمع کے اسم کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ دوسری مثال: ایک فرد کو امت کے اسم سے تعبیر کرنا۔ فرمایا گیا: ان ابراھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا (سورۃ النحل: 120)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک فرد تھے، مگر ان کی خوبیوں کی جامعیت کی وجہ سے انہیں امت یعنی پوری جماعت کے لفظ سے یاد کیا گیا؛ یہاں اسمِ جماعت فردِ واحد کی جگہ آیا ہے۔ تیسری مثال: دو اشخاص کے لیے مفرد کا اسم۔ فرمایا: وجعلنا ابن مریم وامہ آیۃ (سورۃ المؤمنون: 50)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ دو ہستیاں ہیں، مگر دونوں کے لیے لفظ آیۃ مفرد استعمال ہوا، کیونکہ دونوں مل کر ایک ہی نشانی تھے؛ یہاں مفرد کا اسم تثنیے کی جگہ آیا ہے۔

چوتھی مثال: مصدر کا اسم مفعول کی جگہ استعمال۔ فرمایا: ھذا خلق اللہ فاروني ماذا خلق الذین من دونہ (سورۃ لقمان: 11)۔ یہاں خلق مصدر ہے مگر اس سے مراد مخلوق ہے، یعنی اسمِ مفعول کی جگہ مصدر استعمال ہوا ہے۔ پانچویں مثال: اسمِ مفعول کا مصدر کی جگہ استعمال۔ فرمایا: فستبصر ویبصرون، بایکم المفتون (سورۃ القلم: 5 تا 6)۔ مفسرین کے ایک

بڑے قول کے مطابق یہاں المفتون اسم مفعول ہو کر مصدر یعنی فتنے کے معنی میں ہے کہ تم میں سے کسے فتنہ لاحق ہے؛ پس اسم مفعول مصدر کی جگہ آ گیا۔ چھٹی مثال: وقت اور زمانے کے اسم کی باہمی تبدیلی۔ فرمایا: الحج اشھر معلومات (سورۃ البقرہ: 197)۔ ظاہر ہے حج خود مہینے نہیں ہوتا؛ مراد یہ ہے کہ حج کا وقت مشہور مہینے ہیں۔ یہاں حج کا اسم اس کے زمانے کی جگہ اور زمانے کا اسم عمل کی جگہ اس طرح آیا۔ مفسرین نے اسے مجاز وابدال کی مشہور مثالوں میں شمار کیا ہے۔

ساتویں مثال: صفت نما اسم کا ذات کی جگہ استعمال۔ فرمایا: ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (سورۃ الرحمٰن: 27)۔ یہاں وجہ یعنی چہرے کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے، کیونکہ فنا ہر چیز کے لیے ہے اور باقی رہنے والی ذاتِ الٰہی ہے؛ پس ایک خاص اسم دوسرے مفہوم والے اسم کی جگہ آیا۔ آٹھویں مثال: عضو کے اسم کا قدرت و نصرت کی جگہ استعمال۔ فرمایا: ید اللہ فوق ایدیھم (سورۃ الفتح: 10)۔ یہاں ید یعنی ہاتھ کے لفظ سے اللہ کی قدرت، نصرف اور نصرت مراد ہے؛ یہ وہی اسلوب ہے جو عربی محاورے میں عام ہے کہ ہاتھ کو قدرت کی علامت کے طور پر بولا جاتا ہے۔ نویں مثال: محل کے اسم کا اہلِ محل کی جگہ استعمال۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: واسئل القریۃ التی کنا فیھا (سورۃ یوسف: 82)۔ بستی سے سوال نہیں ہو سکتا؛ مراد بستی کے رہنے والوں سے پوچھنا ہے۔ پس قریہ یعنی مکان کا اسم اس کے مکینوں کی جگہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ابدال کی معروف صورت ہے۔

دسویں مثال: ضمیرِ جمع کا ذاتِ واحد کے لیے استعمال باعتبارِ عظمت۔ فرمایا: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (سورۃ الحجر: 9)۔ اللہ تعالیٰ واحد ہے، مگر یہاں انا اور نحن جیسے ضمائر اور جمع کے صیغے شان و عظمت کے اظہار کے لیے آئے ہیں۔ عربی دستور میں ضمیر بھی اسم ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا یہ بھی اسم کی اسم سے تبدیلی کی ایک صورت ہے کہ ایک ہی مرجع کے لیے کبھی مفرد اور کبھی جمع کا ضمیر لایا جاتا ہے۔ ان دس مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ابدال قرآن کے اسلوب کا باقاعدہ حصہ ہے اور اس کی پہچان کے بغیر ان آیات کا وہ مفہوم حاصل نہیں ہو سکتا جو مرادِ الٰہی ہے۔ مفسر جب ان قرائن کو پیشِ نظر رکھتا ہے تو آیت کی تشریح میں اعتدال اور درستگی پیدا ہوتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ابدال سے مراد کلام میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ کی جگہ استعمال کرنا ہے۔ اس کی چار بڑی اقسام ہیں: اسم کی جگہ اسم، فعل کی جگہ فعل، حرف کی جگہ حرف اور جملے کی جگہ جملہ۔ اسم کی اسم سے تبدیلی کی دس قرآنی مثالیں ہیں، جن میں انسان کا اسم مفرد جنس کے معنی میں، ابراہیم علیہ السلام کے لیے امت کا لفظ، ابن مریم اور ان کی والدہ کے لیے مفرد آیۃ، خلق بمعنی مخلوق، مفتون بمعنی فتنہ، حج بمعنی وقتِ حج، وجہ بمعنی ذات، ید بمعنی قدرت، قریہ بمعنی اہلِ قریہ اور ضمیرِ جمع کا استعمال باعتبارِ عظمت شامل ہیں۔ ان مثالوں کا مطالعہ طالب علم کو قرآن کے بلاغی اسلوب سے روشناس کراتا اور تفسیر میں اسے ظاہر پرستی کی گمراہی سے بچاتا ہے۔

سوال نمبر 2: کلام میں مروجہ طریقے پر اضافے کی صورتیں اور قرآنی مثالیں (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ کلام میں مروجہ طریقے پر اضافے کی صورتیں لکھیے اور قرآن مجید سے ان کی مثالیں تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

قرآنِ مجید کے مطالعے میں قاری کو بعض مقامات پر ایسے الفاظ، حروف یا جملے نظر آتے ہیں جو بظاہر اضافی معلوم ہوتے ہیں، یعنی ان کے حذف کر دینے سے بھی جملے کا بنیادی مفہوم قائم رہتا ہے۔ اہلِ عربیّت اور مفسرین کی اصطلاح میں اسے کلام میں اضافہ یا زیادت کہا جاتا ہے۔ اصولِ تفسیر کی بحثوں میں اس اسلوب کو اس لیے زیرِ بحث لایا جاتا ہے کہ ناواقف قاری یا تو ان الفاظ کو بے معنی سمجھ کر نظر انداز کر بیٹھتا ہے یا ان کے ظاہر پر اصرار کر کے غلط مفہوم اخذ کرتا ہے، حالانکہ کلامِ الٰہی میں کوئی لفظ بے مقصد نہیں ہوتا؛ ہر اضافہ تاکید، تنبیہ یا کسی اور بلاغی حکمت کے لیے ہوتا ہے۔ اس جواب میں کلام میں اضافے کا مفہوم اور اس کی حکمت بیان کرنے کے بعد اس کی مروجہ صورتیں قرآنِ مجید کی مثالوں کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

اضافے کا مفہوم اور اس کی حکمت

اضافے سے مراد یہ ہے کہ کلام میں کوئی حرف، لفظ یا جملہ اس طرح آئے کہ اس کے نہ ہونے سے بھی اصل مدعا ادا ہو جائے، مگر اس کے موجود ہونے سے کلام میں ایک خاص قوت، تاکید یا وضاحت پیدا ہو جائے۔ یاد رہے کہ قرآن کے کسی جز کو زائد کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ بے فائدہ یا بے معنی ہے؛ اہلِ علم کی تصریح ہے کہ جسے ہم اضافی کہتے ہیں وہ درحقیقت مفہوم کی تکمیل یا تاکید کا ذریعہ ہوتا ہے، البتہ اسے زائد یا نحوی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ ترکیبِ جملہ اس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ اس اسلوب کی حکمتیں کئی ہیں: کبھی مقصد کلام کی تاکید ہوتا ہے کہ سننے والا اس بات کو معمولی نہ سمجھے؛ کبھی کسی وہم کا ازالہ مقصود ہوتا ہے؛ کبھی تنبیہ و توجہ مقصود ہوتی ہے؛ اور کبھی محض عربی محاورے کی پیروی میں کلام کو روانی اور حسن عطا کرنا ہوتا ہے۔ مفسر کے لیے اضافے کی صورتوں کی پہچان اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہر مقام پر فائدہ تلاش کرے، نہ کہ اسے حذف شدہ سمجھے۔

صورتِ اول: حروف کا اضافہ

کلام میں اضافے کی سب سے مشہور صورت حروف کا اضافہ ہے، جسے علمِ نحو میں حروفِ زائدہ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید سے اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ حرفِ ما کا اضافہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم (سورۃ آل عمران: 159)، یہاں ما تاکید کے لیے زائد ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ کی رحمت ہی سے آپ ان کے لیے نرم ہوئے۔ حرفِ لا کا اضافہ: فرمایا گیا ما منعک الا تسجد اذ امرتک (سورۃ الاعراف: 12)، یہاں لا زائد ہے اور معنی ہے کہ تجھے سجدے سے کس چیز نے روکا۔ حرفِ کاف کا اضافہ: لیس کمثلہ شیء (سورۃ الشوریٰ: 11)، یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک کاف تاکیدِ نفی کے لیے ہے تاکہ مماثلت کی ہر صورت کی نفی ہو جائے۔ حرفِ باء کا اضافہ: وکفی باللہ شھیدا (سورۃ الفتح: 28)، یہاں باء فاعل کے ساتھ تاکید کے لیے آئی ہے۔ حرفِ من کا اضافہ: ھل من خالق غیر اللہ (سورۃ فاطر: 3)، یہاں استفہام میں من کا اضافہ عموم و شمول کی تاکید کے لیے ہے کہ کوئی خالق مطلقاً نہیں سوائے اللہ کے۔ یہ تمام مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ حروف مفہوم خالی نہیں بلکہ بات کو قوی اور جامع بناتے ہیں۔

صورتِ دوم: لفظ واسم کا اضافہ برائے تاکید ورفعِ وہم

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی لفظ یا اسم اس طرح بڑھایا جائے جو کسی ممکنہ غلط فہمی کو دور کر دے۔ اس کی بہترین مثال سورۃ البقرہ میں کفارے کے روزوں کا بیان ہے: فصیام ثلاثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم، تلک عشرۃ کاملۃ (سورۃ البقرہ: 196)۔ یہاں تین اور سات کا مجموعہ دس خود بخود سمجھ آ جاتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے تلک عشرۃ کاملۃ کا اضافہ فرما کر ہر وہم دور کر دیا کہ شاید سات روزے تین کے قائم مقام ہوں یا کل تعداد میں کوئی کمی بیشی ممکن ہو۔ اسی طرح سورۃ التکاثر میں کلا سوف تعلمون کے بعد ثم کلا سوف تعلمون کا اضافہ آیا تاکہ وعید کی تاکید دوچند ہو جائے۔ بعض مقامات پر کسی اسم کو دوبارہ لفظاً ذکر کرنا بھی اسی قبیل سے ہے کہ ایک بار ضمیر سے کام چل سکتا تھا مگر اہمیت کے پیشِ نظر اصل اسم دوبارہ لایا گیا، جیسے نماز کا ذکر کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اسے بار بار نام لے کر بیان کیا گیا۔ یہ اضافے بتاتے ہیں کہ مقصود محض اطلاع نہیں بلکہ دلوں پر اثر ڈالنا ہے۔

صورتِ سوم: جملۂ معترضہ کا اضافہ

تیسری صورت جملۂ معترضہ کا اضافہ ہے، یعنی کلام کے درمیان ایک ایسا جملہ آ جائے جو بنیادی سلسلے سے الگ ہو مگر کسی تنزیہ، دعا یا تنبیہ کے لیے لایا گیا ہو۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے کفار کے الزام کا ذکر یوں فرمایا: ویجعلون للہ البنات، سبحانہ، ولھم مایشتھون (سورۃ النحل: 57)۔ یہاں سبحانہ کا جملہ معترضہ ہے جو کلام کے درمیان اللہ کی پاکیزگی کا اعلان کرتا ہے تاکہ قاری غلط بات سنتے ہی ذہن میں اس کی تردید بھی نقش کر لے۔ اسی طرح بعض مقامات پر دعائیہ جملے اعتراضی طور پر آئے ہیں جو سننے والے کو اسی مقام پر دعا کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جملۂ معترضہ اگر حذف بھی کر دیا جائے تو اصل کلام کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں، لیکن اس کی موجودگی کلام کی شان اور اثر کو بہت بڑھا دیتی ہے، اور یہی اس کے اضافے کی حکمت ہے کہ یہ قاری کے عقیدے اور احساس کی حفاظت کرتا ہے۔

صورتِ چہارم: تکرار کا اضافہ

چوتھی صورت تکرار ہے، یعنی ایک ہی بات یا جملے کو بار بار دہرانا۔ بادی النظر میں یہ اضافہ معلوم ہوتا ہے مگر بلاغت میں یہ تاکید اور تنبیہ کا اعلیٰ اسلوب ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں فبای آلاء ربکما تکذبان کا جملہ اکتیس مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ ہر نعمت کے ذکر کے بعد انسان کو جھنجھوڑا جائے کہ وہ اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلائے گا۔ سورۃ المرسلات میں ویل یومئذ للمکذبین دس مرتبہ آیا ہے اور ہر بار نئی وعید کے سیاق میں اس کی ہیبت بڑھ جاتی ہے۔ سورۃ الشعراء میں ہر نبی کے قصے کے آخر میں ان فی ذلک لآیۃ اور وان ربک لھو العزیز الرحیم کی تکرار ہے جو ہر قصے کو ایک ہی مرکزی سبق سے جوڑ دیتی ہے۔ تکرار کی یہ صورت خاص طور پر وعظ و تذکیر کے مضامین میں اختیار کی گئی ہے، کیونکہ انسانی نفس ایک بار سن کر اثر نہیں لیتا؛ بار بار کی ضرب ہی غفلت کے پردے چاک کرتی ہے، لہٰذا یہ اضافہ بعینہٖ مقصد دہوتا ہے۔

صورتِ پنجم: اجمال کے بعد تفصیل اور توضیحی اضافہ

پانچویں صورت یہ ہے کہ پہلے بات مجمل کہی جائے، پھر اس کی تفصیل یا تفسیر ساتھ اضافے کے طور پر بیان کر دی جائے؛ اسے بلاغت میں اطناب کی ایک قسم شمار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الانشراح میں فرمایا: فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا (سورۃ الشرح: 5 تا 6)؛ دوسرا جملہ پہلے کی تو کید و تفصیل کے طور پر بڑھایا گیا تاکہ تسلی پختہ ہو جائے۔ ایک اور مثال قیامت کے دن کے بیان میں ہے جہاں دن کی ہولناکی اجمالاً بیان کرنے کے بعد اس کی جزئی تفصیلات اضافے کے طور پر آتی ہیں تاکہ منظر پوری طرح آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ اسی طرح کسی حکم کے بیان کے ساتھ اس کی علت یا حکمت کا جملہ اضافہ کر دینا بھی اسی صورت میں شامل ہے، جیسے روزے کے حکم کے ساتھ لعلکم تتقون فرما کر اس کا مقصد واضح کر دیا گیا۔ یہ اضافے قاری کے لیے اجمال کو تفصیل میں بدل دیتے ہیں اور آیت کا مدعا پوری طرح روشن کر دیتے ہیں، اس لیے مفسر انہیں سمجھنے میں خاص توجہ دیتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ کلام میں مروجہ طریقے پر اضافے کی پانچ بڑی صورتیں ہیں: حروف کا اضافہ جیسے ما، لا، کاف، باء اور من کا زائد آنا؛ لفظ و اسم کا اضافہ برائے تاکید و رفعِ وہم جیسے تلک عشرۃ کاملۃ؛ جملۂ معترضہ کا اضافہ جیسے سبحانہ؛ تکرار کا اضافہ جیسے سورۃ الرحمٰن اور المرسلات کی تکرار؛ اور اجمال کے بعد تفصیل و توضیح کا اضافہ۔ یہ اضافے قرآنِ مجید کے اسلوبِ بلاغت کا حصہ ہیں اور ہر ایک کے پیچھے تاکید، تنبیہ، ازالۂ وہم یا توضیح کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ مفسر کا فریضہ ہے کہ وہ ان اضافوں کو بے مقصد سمجھنے کے بجائے ان کے مقاصد کو تلاش کرے، کیونکہ کلامِ الٰہی کا ہر جز اپنے محل پر ایک معنی و مقصد رکھتا ہے۔

سوال نمبر 3: اعجازِ قرآن کا مفہوم اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بیان کردہ وجوہِ اعجاز (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ اعجازِ قرآن کا مفہوم لکھیے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بیان کردہ وجوہِ اعجاز تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

اعجازِ قرآن علومِ قرآن کے مرکزی مباحث میں سے ہے، کیونکہ قرآنِ مجید کی صداقت اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل خود اس کا معجز ہونا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے معجزات عطا ہوئے، مگر آپ کا سب سے بڑا اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ قرآنِ مجید ہے، جس کے مثل لانے سے تمام جن و انس کو عاجز قرار دیا گیا۔ علماء نے اعجاز کے وجوہ پر مستقل کتابیں لکھیں، اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کے باب سوم کی فصل چہارم میں وجوہِ اعجاز پر بحث کی۔ اس جواب میں پہلے اعجاز کا مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر تحدی کا پس منظر، اور آخر میں شاہ ولی اللہ کے بیان کردہ وجوہِ اعجاز تفصیل سے پیش کیے جائیں گے۔

اعجاز کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

اعجاز کا مادہ عجز ہے، جس کے معنی کمزوری، ناتوانائی اور کسی کام سے قاصر رہنا ہیں۔ اعجاز اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں مقابل کو عاجز اور بے بس کر دیا جائے۔ علمِ کلام و تفسیر کی اصطلاح میں اعجازِ قرآن سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ مجید اپنی فصاحت و بلاغت، اپنے نظم و اسلوب، اپنے علوم و معارف اور اپنے اثرات کے اعتبار سے اس درجہ کمال پر ہے کہ تمام مخلوق اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر لانے سے عاجز ہے، اور یہی عجز اس کے الٰہی کلام ہونے کی دلیل ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا کلام ہے۔ معجزے کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ خارقِ عادت امر ہو جو نبوت کے دعوے کے ساتھ ظاہر ہو اور مقابلے کی دعوت کے باوجود کوئی اس کا مثل نہ لا سکے۔ قرآن اس تعریف پر پوری طرح صادق آتا ہے، کیونکہ یہ چودہ سو برس سے اپنی تحدی پر قائم ہے اور آج تک کوئی اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔

تحدی اور اس کے مراحل

قرآنِ مجید نے اپنے معجز ہونے کا چیلنج باقاعدہ اور مرحلہ وار دیا ہے، جسے تحدی کہا جاتا ہے۔ پہلے پورے قرآن کے مثل کلام لانے کی دعوت دی گئی کہ اگر تمہیں اس کے انسان کے کلام ہونے میں شبہ ہے تو اس جیسی کتاب بنا لاؤ۔ پھر دس سورتوں کی دعوت دی گئی، اور آخر میں ایک ہی سورت کے مثل لانے کا چیلنج دیا گیا: وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین (سورۃ البقرہ: 23)، اور ساتھ ہی قطعی اعلان کر دیا گیا کہ اگر تم ایسا نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ عرب کے فصحاء اور بلغاء، جنہیں اپنی زبان پر ناز تھا اور جو اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، اس چیلنج کے باوجود ایک سورت کا مثل نہ لا سکے، حالانکہ ان کے پاس محرک بھی تھا، صلاحیت کا دعویٰ بھی اور مقابلے کا میدان بھی کھلا تھا۔ یہی تاریخی حقیقت اعجازِ قرآن کی سادہ اور مضبوط دلیل ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بیان کردہ وجوہِ اعجاز

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر میں وجوہِ اعجاز کو بیان کرتے ہوئے قرآن کے کئی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ پہلی وجہ قرآن کا بے نظیر نظم و اسلوب اور اس کی بلاغت ہے۔ قرآن نے عربی زبان کے تمام معروف اسالیب، یعنی خطبہ، قصہ، مثل، مکالمہ اور وعظ کو اس طرح یکجا کیا ہے کہ ہر اسلوب اپنے کمال پر

نظر آتا ہے، اور اس کا اسلوب نہ شعر ہے نہ نثر، مگر دونوں سے بلند و منفرد ہے۔ سورتوں کی ترتیب، آیات کی مناسبت اور مضامین کی غیر مرتب ظاہری صورت کے باوجود باطنی ربط و نظم اس کی وہ خصوصیت ہے کہ جس پر غور کرنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے باب سوم میں اس بدیع اسلوب کی لطافتوں کو الگ بحث کا موضوع بنایا ہے، جو خود اس بات کی علامت ہے کہ ان کے نزدیک اعجاز کا مرکزی مرکز قرآن کا یہی انوکھا نظم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کلام ایک امی سے صادر ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی سے پڑھنا لکھنا سیکھا، نہ اہلِ کتاب کے مدارس میں تعلیم پائی، اس کے باوجود آپ کی زبان سے وہ علوم و معارف جاری ہوئے جن تک دنیا کے بڑے بڑے اہلِ علم کی رسائی نہ تھی۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ تناسب بذاتِ خود اعجاز ہے کہ کلام کی عظمت اور لانے والے کی امیّت میں جو فرق ہے وہ انسانی صلاحیت سے پُر نہیں ہو سکتا۔ تیسری وجہ اخبارِ غیبیہ ہیں، یعنی مستقبل کی وہ خبریں جو قرآن نے دیں اور حرف بحرف پوری ہوئیں؛ جیسے رومیوں کی شکست کے بعد چند برسوں میں ان کی فتح کی پیش گوئی، فتحِ مکہ کی بشارت اور اسلام کے غلبے کے وعدے۔ چوتھی وجہ علوم و معارف کی جامعیت ہے کہ قرآن نے عقائد، عبادات، اخلاق، معیشت، معاشرت اور سیاست کے اصول اس جامعیت سے بیان کیے کہ ہر دور کے انسان کے لیے رہنمائی موجود ہے، اور یہ سب ایک مختصر سی کتاب میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ انسانی تصنیف کے بس کی بات نہیں۔

پانچویں وجہ قرآن کا باہمی اختلاف و تناقض سے پاک ہونا ہے۔ یہ کتاب تیئیس برس کے لمبے عرصے میں، مختلف حالات و مقامات میں نازل ہوئی؛ کبھی مکہ کی سختیوں میں، کبھی مدینہ کی ریاست میں، کبھی جنگ میں کبھی امن میں، مگر اس کے مضامین میں نہ تعارض ہے نہ فکری ارتقاء کی وہ جھلک جو انسانی تصانیف میں لازماً آ جاتی ہے۔ خود قرآن نے اسے دلیل بنایا کہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔ چھٹی وجہ گزشتہ امتوں اور انبیاء کے حالات کی صحیح خبر ہے کہ گزشتہ کتب کے قصص اور بائبل کی روایات میں جو تحریفات آ چکی تھیں، قرآن نے ان واقعات کو ان کی صحیح صورت میں بیان کیا، حالانکہ لانے والے کے پاس ان معلومات کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے مجموعی نقطۂ نظر میں اعجاز صرف الفاظ کی بلاغت کا نام نہیں بلکہ نظم، مضامین، اخبارِ غیب، جامعیت اور لانے والے کی حالت سب کا مجموعہ ہے، اور یہی جامعیت ان کی بحث کو دیگر مفسرین سے ممتاز کرتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اعجازِ قرآن سے مراد قرآن کا وہ کمال ہے جس کے مقابلے میں تمام مخلوق عاجز ہے اور جس سے اس کا کلامِ الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ قرآن نے پورے کلام، دس سورتوں اور بالآخر ایک سورت تک کا چیلنج مرحلہ وار دیا اور عرب کے فصحاء اس کا جواب نہ دے سکے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بیان کردہ وجوہِ اعجاز میں قرآن کا بے نظیر نظم و بلاغت اور بدیع اسلوب، اس کا امی سے صادر ہونا، اخبارِ غیبیہ کا ثابت ہونا، علوم و معارف کی جامعیت، تناقض و اختلاف سے پاک ہونا اور گزشتہ امم کے احوال کی صحیح خبر شامل ہیں۔ یہ وجوہ مل کر ثابت کرتی ہیں کہ قرآن کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ معجز کلام ہے جو قیامت تک اپنی تحدی پر قائم رہے گا۔

سوال نمبر 4: توجیہ کا طریقہ اور متشابہات کی تاویل کا طریقہ (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ توجیہ کا طریقہ اور متشابہات کی تاویل کا طریقہ تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

قرآنِ مجید کی بعض آیات بظاہر مشکل اور پیچیدہ معلوم ہوتی ہیں؛ کہیں کسی آیت کے کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے، کہیں کوئی تعبیر عام فہم سے ہٹ کر آتی ہے، اور کہیں ایسی آیات ہیں جنہیں محکمات کے مقابلے میں متشابہات کہا گیا ہے۔ ان مقامات سے نمٹنے کے لیے علماء نے دو اہم طریقے بیان کیے ہیں: ایک توجیہ کا طریقہ اور دوسرا متشابہات کی تاویل کا طریقہ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر میں نظمِ قرآن کے خفا کو دور کرنے اور متشابہات سے متعلق جو رہنمائی دی ہے، اسی کی روشنی میں اس جواب میں پہلے توجیہ کا مفہوم اور اس کا مرحلہ وار طریقہ بیان کیا جائے گا، پھر متشابہات کا مفہوم اور ان کی تاویل کے سلفی و خلفی مناہج اور ان کے اصول پیش کیے جائیں گے۔

توجیہ کا مفہوم

توجیہ کے لغوی معنی کسی چیز کا رخ متعین کرنا، کسی بات کی مناسب صورت نکالنا اور کسی مشکل عبارت کی ایسی تشریح کرنا ہے کہ وہ سیاق اور اصولوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔

اصولِ تفسیر کی اصطلاح میں توجیہ سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی آیت یا لفظ کے ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہو، یا اس کا ظاہر کسی دوسری نص یا مسلمہ اصول سے بظاہر ٹکراتا نظر آئے، تو مفسر قرائن و دلائل کی روشنی میں اس معنی کو اختیار کرے جو نصِ لغت اور سیاق سے سب سے زیادہ ہم آہنگ ہو، اور دوسرے محتمل معانی کے مقابلے میں اس کی ترجیح کی وجہ بھی بیان کرے۔ توجیہ محض تکلف یا اپنی رائے ٹھونسنے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک علمی عمل ہے جو اس لیے کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں نہ حقیقی تعارض ہے، نہ بے ربطی؛ ظاہری دشواری اکثر قاری کی ناواقفیت کی وجہ سے ہوتی ہے، اور صحیح توجیہ اس دشواری کو دور کر دیتی ہے۔

توجیہ کا طریقہ کار

توجیہ کا درست طریقہ چند مرتب مراحل پر مشتمل ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مفسر سب سے پہلے قرآن ہی کی طرف رجوع کرے؛ کیونکہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے، پس جس آیت میں ابہام ہو اس کی توجیہ اسی موضوع کی واضح آیات کی روشنی میں کی جائے۔ دوسرا مرحلہ سنتِ نبوی کی طرف رجوع ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے سب سے بڑے شارح ہیں اور بہت سی مشکل آیات کی توجیہ آپ کے عمل و ارشاد سے مل جاتی ہے۔ تیسرا مرحلہ اقوالِ صحابہ و تابعین کی مراجعت ہے، کیونکہ وہ نزول کے زمانے اور اہلِ زبان کے مزاج سے سب سے قریب تھے۔ چوتھا مرحلہ لغتِ عرب اور اس کے محاورات کا اعتبار ہے؛ کوئی توجیہ اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک وہ لفظ لغت میں اس معنی کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ پانچواں مرحلہ سیاق و سباق اور نظمِ آیت کا لحاظ ہے؛ ہر لفظ اپنے محل پر ایک خاص قرینہ رکھتا ہے اور توجیہ اسی قرینے سے نکلتی ہے۔ چھٹا مرحلہ یہ ہے کہ تمام محتمل معانی کو سامنے رکھ کر ان میں سے اسے ترجیح دی جائے جو دلیل کے اعتبار سے سب سے قوی ہو، اور ترجیح کی وجہ صراحت سے بیان کی جائے تاکہ قاری مطمئن ہو سکے۔

اس طریقے کی ایک مثال یہ ہے کہ بعض آیات میں لفظ ایسا آیا ہے جس کے اصل معنی لیں تو مفہوم بگڑتا ہے، مگر جب اسے عرب محاورے کے دوسرے معروف معنی میں لیا جائے تو آیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں بظاہر دو آیتوں میں فرق معلوم ہو، وہاں توجیہ کے ذریعے دکھایا جاتا ہے کہ دونوں کا محل الگ الگ ہے؛ ایک کا تعلق ایک صورت سے ہے اور دوسری کا دوسری صورت سے، لہٰذا تعارض درحقیقت موجود ہی نہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے نسخ کی بحث میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ پندرہ آیات کو منسوخ کہنے کے بجائے ان کی ایسی توجیہ کر دی کہ ہر آیت اپنے کر پر محکم ٹھہری۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توجیہ مفسر کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ آیات کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں غیر ضروری نسخ، تحریف یا بے ربطی کے الزام سے بچاتا ہے، بشرطیکہ یہ اصول کے دائرے میں ہو۔

متشابہات کا مفہوم و اقسام

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں قرآن کی آیات کو دو قسموں میں تقسیم فرمایا ہے: ایک محکمات جو کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہات۔ محکم وہ آیت ہے جس کا مفہوم واضح اور قطعی ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، جبکہ متشابہ وہ ہے جس کا مفہوم عام قاری پر مشتبہ رہ جائے یا اس کی حقیقت و کیفیت انسانی علم کی گرفت میں نہ آتی ہو۔ علماء نے متشابہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک متشابہ حقیقی، جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، جیسے قیامت کے وقوع کا وقت، روح کی حقیقت اور حروفِ مقطعات کے اسرار؛ اور دوسرا متشابہ اضافی، جو کسی قاری کے لیے اس کی کم علمی کی وجہ سے مشکل ہو مگر علم رکھنے والوں کے لیے قابلِ حل ہو، جیسے لغت، بلاغت یا دیگر علوم کی روشنی میں کھل جانے والی آیات۔ فتنے کا سبب یہی دوسری قسم بنتی ہے جب ناواقف لوگ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں، جس کی قرآن نے مذمت کی ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنے کی تلاش میں متشابہات کے درپے ہوتے ہیں۔

متشابہات کی تاویل کا طریقہ: سلف و خلف کے مناہج

متشابہات کی تاویل میں اہلِ علم کے دو مشہور منہج رہے ہیں۔ پہلا منہج سلف یعنی صحابہ، تابعین اور ائمہ متقدمین کا ہے، جسے تفویض کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق صفاتِ باری تعالیٰ اور اسی قبیل کی متشابہ آیات پر اسی طرح ایمان لایا جاتا ہے جس طرح وہ آئی ہیں؛ ان کا وہ معنی مراد لیا جاتا ہے جو اللہ کی شان کے لائق ہے، اور ان کی کیفیت و حقیقت

کا علم اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے استواء کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال بدعت ہے۔ یہ طریقہ تسلیم و تنزیہہ دونوں کا مجموعہ ہے کہ نہ اللہ کو مخلوق پر قیاس کیا جائے، نہ نصوص کو معطل قرار دیا جائے۔ دوسرا منہج متاخرین اہلِ کلام کا ہے، جسے تاویل کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق جب کسی متشابہ آیت کا ظاہر اللہ کی تنزیہہ سے بظاہر ٹکراتا نظر آئے تو اس لفظ کی وہ تاویل کی جاتی ہے جو لغتِ عرب میں اس کی صلاحیت رکھتی ہو اور محکم آیات سے مطابقت رکھتی ہو؛ مثلاً ید سے قدرت و نعمت اور وجہ سے ذات مراد لینا۔

عملی اصول اور مثالیں

ان دونوں مناہج کے ساتھ مفسر چند عملی اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ پہلا اصول یہ ہے کہ متشابہ کو ہمیشہ محکم کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ قرآن نے محکمات کو ام الکتاب یعنی اصل قرار دیا ہے، پس جو مفہوم محکمات سے ٹکرائے وہ درست نہیں ہو سکتا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ تنزیہہ ہر حال میں برقرار رکھی جائے؛ اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرمایا گیا لیس کمثلہ شیء، لہٰذا کوئی تاویل یا اثبات اس شان کے خلاف نہیں ہو سکتا جو مخلوق سے مشابہت پیدا کرے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ تاویل اسی وقت کی جائے جب ظاہری معنی لغت، عقلِ سلیم اور محکم نصوص کی روشنی میں ناممکن ہو، اور تاویل لغت کی حدود کے اندر ہو؛ ذاتی پسند کی بنیاد پر کی گئی تاویل دراصل تحریف ہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ جس متشابہ کی حقیقت انسانی علم سے باہر ہو، جیسے قیامت کا وقت یا روح کی ماہیت، وہاں تاویل کی کوشش کے بجائے تفویض ہی اختیار کی جائے، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ حروفِ مقطعات جیسے الم اور حم کے بارے میں اقوال کی کثرت کے باوجود سب سے محفوظ راستہ یہی بیان کیا جائے کہ ان کے اسرار کا قطعی علم اللہ کو ہے۔

مثال کے طور پر ید اللہ والی آیات میں سلف نے یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے وہ صفت ثابت ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، بلا کیف و بلا تشبیہ؛ اور خلف نے قرائن کی بنا پر قدرت و نعمت کی تاویل کی۔ اسی طرح الرحمن علی العرش استویٰ میں سلف نے اثبات مع تفویضِ کیف اختیار کیا جبکہ متاخرین نے استیلاء و اقتدار کی تفسیر پیش کی۔ دونوں صورتوں میں اصل مقصد ایک ہی ہے کہ اللہ کی تنزیہہ بھی قائم رہے اور نص بھی معطل نہ ہو۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا مزاج بھی اسی اعتدال کا ترجمان ہے کہ سلف کے طریقے کو اصل مانا

جائے، بے جا تاویل سے بچا جائے، اور جہاں کلام کے اسلوب و محاورے سے تاویل کی راہ کھلتی ہو وہاں اتنی ہی مقدار اختیار کی جائے جتنی سے اشکال رفع ہو جائے؛ اس سے آگے بڑھ کر غیبی امور کی کھوج میں پڑنا قرآن کے مقصد کے بھی خلاف ہے اور فتنے کا دروازہ بھی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ توجیہ کا طریقہ یہ ہے کہ مشکل و محتمل المعنی آیت کی تشریح قرآن، سنت، اقوالِ سلف، لغتِ عرب اور سیاق و قرائن کی روشنی میں اس طرح کی جائے کہ نصوص میں ہم آہنگی ثابت ہو اور ترجیح یافتہ معنی کی دلیل بھی پیش کی جائے۔ متشابہات کی تاویل کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں محکمات کی طرف لوٹایا جائے؛ سلف کے منہج پر ایمان بالصفت مع تفویضِ کیفیت اختیار کی جائے، اور ضرورت کے مقام پر لغت و تنزیہہ کی حدود میں محدود تاویل کی جائے، جبکہ جن امور کی حقیقت انسانی علم سے باہر ہے ان میں تفویض ہی سلامتی کا راستہ ہے۔ یہ دونوں طریقے مفسر کو تشبیہ و تعطیل کی دو انتہاؤں سے بچا کر اہلِ سنت کے معتدل راستے پر قائم رکھتے ہیں۔

سوال نمبر 5: کنایہ اور تعریض کا مفہوم؛ قرآنِ مجید کی مثالوں سے وضاحت (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ کنایہ اور تعریض کا مفہوم بیان کیجیے اور قرآن مجید کی مثالوں سے ان اصطلاحات کی وضاحت لکھیے۔ (20)

تعارف

قرآنِ مجید کا اسلوبِ بیان بلاغت کے اعلیٰ ترین نمونوں پر مشتمل ہے، اور اس بلاغت کی ایک نمایاں صورت یہ ہے کہ بات ہمیشہ براہِ راست اور دوٹوک الفاظ میں نہیں کہی جاتی، بلکہ کبھی اشارے میں، کبھی لازمِ معنی کے ذریعے اور کبھی دوسرے کو سناتے ہوئے اصل مخاطب کو سمجھایا جاتا ہے۔ علمِ بلاغت کی دو اصطلاحیں کنایہ اور تعریض اسی اسلوب کی تفہیم کے لیے وضع کی گئی ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بھی الفوز الکبیر میں نظمِ قرآن کے خفا کے اسباب میں ان اسالیب کی طرف توجہ دلائی ہے، کیونکہ ان سے واقفیت کے بغیر قاری بعض آیات کا اصل مدعا نہیں پا سکتا۔ اس جواب میں پہلے کنایہ کا مفہوم، اقسام اور قرآنی مثالیں بیان ہوں گی، پھر تعریض کا مفہوم اور اس کی مثالیں، اور آخر میں دونوں کا باہمی فرق واضح کیا جائے گا۔

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ — علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی — اصولِ تفسیر (1954) — امتحانی مشق نمبر 2 — صفحہ 17

کنایہ کا مفہوم و اقسام

کنایہ کے لغوی معنی چھپانا اور کسی بات کو پوشیدہ انداز میں کہنا ہیں۔ علم بلاغت کی اصطلاح میں کنایہ ایسے لفظ یا کلام کو کہتے ہیں جو اپنے حقیقی معنی کے بجائے اس کے لازم معنی میں استعمال ہو، اس طرح کہ حقیقی معنی کا ارادہ کرنا بھی ممکن رہے۔ مثلاً کسی کے لیے یہ کہنا کہ اس کا چولھا ٹھنڈا نہیں ہوتا، کنایہ ہے سخی ہونے سے، کیونکہ مہمان نوازی کا لازمہ چولھے کا جلتے رہنا ہے۔ کنایہ کی خوبی یہ ہے کہ بات پردے میں اور مہذب انداز کے ساتھ کہی جاتی ہے، جس سے مفہوم بھی مکمل ادا ہوتا ہے اور دل آویزی و اثر بھی پیدا ہوتا ہے۔ اہلِ بلاغت نے کنایہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں: کنایہ عن الصفت، جہاں صفت کو کسی علامت کے ذریعے ذکر کیا جائے؛ کنایہ عن الموصوف، جہاں موصوف کو اس کی صفت کے ذریعے یاد کیا جائے؛ اور کنایہ عن النسبہ، جہاں صفت کی نسبت کسی اور طرف کر کے اصل موصوف مراد لیا جائے۔ قرآنِ مجید میں یہ تینوں صورتیں موجود ہیں اور مفسرین ان کی نشاندہی کر کے آیت کے لطف کو واضح کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں کنایہ کی مثالیں

قرآنِ مجید میں کنایہ کی عمدہ مثالیں کئی مقامات پر ملتی ہیں۔ پہلی مثال میاں بیوی کے تعلق کے بیان میں ہے: فرمایا اولامستم النساء (سورۃ النساء: 43)۔ یہاں لمس یعنی چھونے کا لفظ جماع سے کنایہ ہے؛ شریعت نے نازک اور شرم و حیا کے منافی مضمون کو اس پردے والے اسلوب میں بیان کیا تاکہ تقدس قائم رہے۔ اسی طرح فرمایا گیا ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (سورۃ البقرہ: 187)، جس میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہہ کر ان کے باہمی قرب، التصاق اور ایک دوسرے کے پردہ و ستر ہونے کی طرف کنائی اشارہ ہے۔ دوسری مشہور مثال بخل و سخاوت کا بیان ہے: فرمایا ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط (سورۃ الاسراء: 29)۔ ہاتھ کا گردن سے بندھا ہونا بخل سے کنایہ ہے اور ہاتھ کا پورا کھلا ہونا فضول خرچی و سخاوت کی حد سے تجاوز سے کنایہ ہے۔ یہودیوں کے قول کی حکایت میں بھی یہی کنایہ آیا کہ ید اللہ مغلولۃ، یعنی انہوں نے اللہ کی شان میں بخل کی نسبت کا گستاخانہ کنایہ استعمال کیا جس کی قرآن نے سختی سے تردید کی۔

تیسری مثال غیظ وغضب کا کنایہ ہے: فرمایا عضوا علیکم الانامل من الغیظ (سورۃ آل عمران: 119)، یعنی دشمنانِ اسلام غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں؛ انگلیاں چبانا شدتِ غیظ سے کنایہ ہے جو انسانی مزاج کی معروف علامت ہے۔ چوتھی مثال سورۃ ص میں داؤد علیہ السلام کے واقعے میں نعجۃ کا لفظ ہے، جس کے بارے میں بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عورت سے کنایہ ہے، کیونکہ عرب محاورے میں بکری کو عورت کی کنائی تعبیر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پانچویں مثال قیامت کی ہولناکی کا بیان ہے: یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود (سورۃ القلم: 42)، جس میں پنڈلی کا کھلنا دن کی شدت وعظمت اور معاملے کی ہولناکی سے کنایہ قرار دیا گیا ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کنایہ قرآن کے ادب وتہذیب کا خاصہ ہے، جس سے نازک مضامین بھی شرافت کے ساتھ ادا ہوتے ہیں اور گہرے جذبات بھی اپنے پوری قوت کے ساتھ منتقل ہو جاتے ہیں۔

تعریض کا مفہوم

تعریض کے لغوی معنی کسی بات کو چوڑائی میں یعنی اشارے اور پہلو سے کہنا ہیں، اس کے مقابلے میں تصریح ہے جس میں بات صاف اور براہِ راست کہی جائے۔ اصطلاح میں تعریض اس اسلوب کو کہتے ہیں کہ کلام بظاہر کسی اور سے یا کسی اور کے بارے میں ہو، مگر اس کا اصل اشارہ و متکلم کسی اور طرف ہو اور اصل مخاطب یا سامع قرینے سے خود سمجھ جائے کہ بات در حقیقت اس سے متعلق ہے۔ تعریض کے کئی مقاصد ہوتے ہیں: مخاطب کی عزتِ نفس کا لحاظ کہ بات ڈانٹ کے بجائے نرمی سے پہنچ جائے؛ کسی بڑی حقیقت کو منطقی طور پر منوانے کے لیے اسلوبِ جدل کا استعمال؛ یا مخاطب کو اس کے اپنے موقف کی کمزوری دکھانا کہ وہ خود نتیجہ اخذ کرے۔ تعریض توریے سے قریب بھی ہے مگر اس سے الگ حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ توریے میں لفظ کے قریبی معنی سے سننے والا دھوکا کھاتا ہے جبکہ تعریض میں اشارہ سمجھنے والے کے لیے واضح ہوتا ہے، بس براہِ راست نام یا خطاب نہیں ہوتا۔

قرآنِ مجید میں تعریض کی مثالیں

قرآنِ مجید میں تعریض کی سب سے مشہور مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ جب قوم نے پوچھا کہ بتوں کو کس نے توڑا ہے تو انہوں نے فرمایا: بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون (سورۃ الانبیاء: 63)۔ ظاہر ہے مقصد یہ نہیں تھا کہ واقعہ کی غلط خبر دی جائے، بلکہ تعریض مقصود تھی کہ بتوں کی بے بسی کو ان کے اپنے منہ سے

اگلوایا جائے؛ نتیجہ یہی ہوا کہ قوم نے خود کہا کہ تم ہی ظالم ہو، اور وہ اپنے دلوں میں لوٹ کر شرمندہ ہوئے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ انی سقیم (سورۃ الصافات: 89) بھی تعریض وتوریے کی مثالوں میں آتا ہے، جس سے انہوں نے قوم کے میلے میں شرکت سے معذرت کی اور موقع پا کر بت شکنی کا عظیم کام انجام دیا۔ تیسری مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ قول ہے: ان یسرق فقد سرق اخ لہ من قبل (سورۃ یوسف: 77)؛ یہاں بھائیوں نے تعریضاً حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی طرف اشارہ کیا تھا، حالانکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ مخاطب خود یوسفؑ ہیں، اور قرآن نے اس موقع پر یوسف کے ضبطِ نفس کو بھی بیان کیا کہ انہوں نے بات دل میں رکھ لی اور انہیں ظاہر نہ کیا۔

چوتھی مثال مؤمنِ آلِ فرعون کی گفتگو ہے جو سورۃ غافر میں تفصیل سے آئی ہے۔ اس نے اپنی قوم کو براہِ راست ملامت کرنے کے بجائے تعریضی انداز میں خطاب کیا کہ اے میری قوم! آج بادشاہت تمہاری ہے، مگر اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو ہماری مدد کون کرے گا؟ یہاں اپنے آپ کو رکھ شامل کر کے اس نے بات اس نرمی سے کہی کہ اثر بھی ہو اور مخاطب متنفر بھی نہ ہو۔ پانچویں مثال اللہ تعالیٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے دن یہ سوال ہے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنالو؟ یہ سوال بظاہر استفسار ہے مگر حقیقت میں ان کے نام پر شرک کرنے والوں کے لیے تعریضی گرفت اور عیسیٰ علیہ السلام کی براءت کا اعلان ہے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعریض قرآن کے جدلی و دعوتی اسلوب کا اہم حصہ ہے جس سے بات مخاطب کے دل میں خود بخود اتر جاتی ہے۔

کنایہ اور تعریض کا فرق؛ نتیجہ سمیت

کنایہ اور تعریض میں بنیادی فرق تین جہتوں سے واضح ہوتا ہے۔ پہلا فرق یہ کہ کنایہ کا تعلق لفظ اور اس کے لازم معنی سے ہے؛ لفظ بدل جاتا ہے اور اس کی جگہ اس کی علامت آ جاتی ہے، جبکہ تعریض کا تعلق پورے کلام کے رخ اور مقصد سے ہے؛ الفاظ اپنی جگہ درست ہوتے ہیں، بس ان کا اشارہ اصل مخاطب کی طرف ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی کا ارادہ بھی ممکن رہتا ہے، جبکہ تعریض میں ظاہری مخاطب یا ظاہری خبر اصل مقصود نہیں ہوتی۔ تیسرا فرق یہ کہ کنایہ عموماً تہذیب، اختصار اور تاثیر کے لیے آتا ہے، جبکہ تعریض عموماً تنبیہ، حجت قائم کرنے اور مخاطب کی عزتِ نفس کے لحاظ کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کنایہ وہ اسلوب ہے جس میں بات لازمِ معنی کے

پردے میں کہی جائے، جیسے لمس سے جماع اور یدِ مغلولہ سے بخل مراد لینا، اور تعریض وہ اسلوب ہے جس میں بات دوسرے کو سناتے ہوئے اصل مدعا تک پہنچائی جائے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کبیر ھم کی طرف نسبت کرنا۔ دونوں اسالیب کی پہچان مفسر کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ ان سے ناواقفی میں قاری کنایے کو حقیقت اور تعریض کو تصریح سمجھ بیٹھتا ہے اور آیت کا وہ لطف و مدعا حاصل نہیں کر پاتا جو اس کے اسلوب میں پنہاں ہے۔ یہی بلاغی شعور قرآن فہمی کو محض ترجمہ خوانی سے بلند کر کے تدبر کی منزل تک لے جاتا ہے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com